تدریب المعلّمین - اُستاذ سازی

وقت کی اہم ضرورت

مولانا عمران عیسیٰ زید مجدہ

تمہید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف معلم بنا کر بھیجا: ''إنما بعثت معلما'' بلکہ اُمت کے لیے مربّی بھی بنایا اور اس عظیم کام کی نگرانی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی، چناں چہ ارشاد ہوا: ''علمنی ربی فأحسن تعلیمی و أدبنی ربی فأحسن تادیبی ۔'' بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہنا بھی بالکل حق ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہی نہیں، معلم گر اور انسان ساز تھے۔ اسی کا ثمر تھا کہ ۲۳ سال کے قلیل عرصے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صورت میں ایک عظیم گلدستہ تیار ہوا، جنہوں نے ایمان واسلام کو صرف قبول نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اپنے اندر جذب کر لیں۔ اس کا ایک پرتو ہمیں کتب احادیث میں ان روایات وارشادات کی صورت میں نظر آتا ہے، جو مناقب کے تحت محدثین لائے ہیں، مثلاً: ''أقرأهم أبی بن کعب ، أعلمهم بالحلال و الحرام معاذ بن جبل و أفرضهم زید بن ثابت'' وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ارشاد نبوی: ''لو کان بعدی نبی لکان عمرؓ۔'' جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کمال پر دلیل ہے، وہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسان سازی کی اعلیٰ وارفع شان کو بھی بتاتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا محمد احسان الحق صاحب (خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث واستاذ الحدیث مدرسہ عربیہ رائیونڈ) اور صدر وفاق حضرت ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب اسکندر مدظلہٗ دونوں سے سنی (اگرچہ دونوں کی تعبیر جدا جدا ہے، مگر مفہوم ایک ہی ہے) کہ کامیاب مدرس واستاذ کا مخلص ہونا ضروری ہے اور اخلاص کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر جذبہ ہو کہ میرے شاگرد کو پیش نظر کتاب مجھ سے بہتر آجائے اور جیسے صلبی اولاد میں باپ کبھی حسد میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ترقی کو اپنے لیے خوشی وافتخار سمجھتا ہے،

یہی حال ایک مخلص استاذ ومربّی کا ہوتا ہے۔

رجال کار تیار کرنے کا جذبہ

پھر انسان سازی کا یہ جذبہ صحابہؓ کو اور ’’قرناً بعد قرنٍ ‘‘ ہر زمانے کے ائمہ وعلماء کو ورثہ میں ملا۔ اس پر ایک دلچسپ قصہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے حیاۃ الصحابہؓ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ساتھیوں سے پوچھا: اپنی اپنی خواہش کا اظہار کرو۔ اس پر ایک صاحب نے عرض کیا: میری آرزو یہ ہے کہ یہ گھر دراہم سے بھرا ہوا ہو اور میں اس سب کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کوئی اور اپنی خواہش ظاہر کرے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ: میں تو یہ چاہوں گا کہ اس گھر کو سونے سے بھر دیا جائے اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کر ڈالوں۔ تیسرے صاحب نے یہ تمنا کی کہ یہ گھر قیمتی جواہر سے بھرا ہوا ہو اور میں اس کو راہِ خدا میں لُٹا دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر سوال دہرایا تو ساتھیوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ اس سے بڑھ کر کیا تمنا کی جاسکتی ہے؟! اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میری تمنا تو ہے کہ اس گھر میں ابو عبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جیسے لوگ ہوں اور ان کو اللہ کی فرمانبرداری کے کاموں میں استعمال کروں۔ (حیاۃ الصحابہؓ، باب انفاق الصحابۃ رضی اللہ عنہم)

یہ اُمت بانجھ نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال حوصلہ افزائی دیکھئے کہ صرف حضرات سابقین واولین کے فضائل ومناقب نہیں سنائے، بلکہ اپنی اُمت کے آخری طبقہ کو بھی خوشخبری سنا کر گئے، چناں چہ ارشاد فرمایا کہ: ’’میری اُمت کی مثال بارش کی سی ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ نفع بخش ہے یا آخری حصہ۔‘‘ گویا امت کا آخری طبقہ بھی صحابہؓ جیسے کارنامے بے شک سرانجام نہ دے سکے، مگر خیر ورشد سے وہ بھی خالی نہیں۔

تب ہی تو ہم اکابر کے سوانح میں پڑھتے ہیں کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے کہا گیا کہ: ’’صحابہؓ کا قافلہ جارہا تھا، یہ بچھڑ کر پیچھے آ گئے۔‘‘ اور بانی تبلیغ حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ کے بارے میں ان کی والدہ کہا کرتی تھیں کہ: ’’مجھے اس بچے سے صحابہؓ کی خوشبو آتی ہے۔‘‘

آمدم برسرِ مطلب

مقصد اس تمہید کا یہ ہے کہ ہمارے اکابر علماء کی اخلاص کے ساتھ پیہم محنت کا ثمرہ جہاں دینی مدارس اور پھر وفاق المدارس کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، جس کے ایک بورڈ کے تحت عالمیہ کا امتحان دے کر کامیاب ہونے والے

طلبہ کی تعداد ۱۴۳۹ھ میں دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہ تعداد عصری اور دنیاوی اداروں کے لحاظ وتناسب سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، مگر یہ تعداد بھی کم نہیں۔ آخر کو فرمانِ باری عزّ اسمہٗ ''إن یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین ''اور حدیث کا ارشاد ''لن یغلب اثنا عشر من قلة '' سیرتِ طیبہ میں بدر کے ۳۱۳ کا تین چند کو شکست فاش دینا اور پھر خالد بن ولید کا ایک موقع پر ۶۰۰۰۰ کے مقابلے میں ۶۰ افراد کا لے جانا' ہمیں بتاتا ہے کہ کمیت سے زیادہ کیفیت مطلوب ہے۔ فیصلہ گنتی پر نہیں، بلکہ صفات پر ہوتا ہے۔ مسئلہ اس وقت دین پڑھنے والوں کے عدد کا نہیں، بلکہ المیہ یہ ہے کہ یہ فضلاء وعلماء آیا اُمت کی رہنمائی کے بوجھ کے متحمل ہیں؟

زیرِ نظر مضمون کے ذریعہ اس طرف توجہ دلانا مقصد ہے کہ اپنے نوجوان فضلاء وعلماء کو سنبھال کر ان کی تربیت کی اگر عملی صورت ہو جائے تو یہ نہ صرف ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنیں گے، بلکہ دین کی محنت کی جس بھی شکل وترتیب میں اللہ نے لگایا ہوا ہے، یہ نوجوان فضلاء اکابر کے سچے ولائق نائب وجانشین بن کر دین کی آبیاری کا کام آگے بڑھاتے رہیں گے۔

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''

ویسے تو انحطاط اور زوال کی باتیں زبان زدِ عام ہیں، مگر ہمارا دین ہمیں مثبت سوچ رکھنے کی ترغیب دیتا ہے، اسی لیے ناامیدی کی دین میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ شکر ہی کا ایک پہلو یہ بات بھی ہے کہ ہم اُس دور سے گزر رہے ہیں جس میں سائنس کی ترقی کی وجہ سے عمومی استعداد قوی ہے۔ ہمارا اس وقت بڑا مسئلہ یکسوئی کے فقدان کا ہے جو کافی حد تک رہنمائی/ترغیب/مذاکرے سے دور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے وہی طالب علم جس سے ہم نالاں نظر آتے ہیں وہ بھی فراغت کے بعد تخصص میں داخلے کا خواہشمند نظر آتا ہے، دراصل اس کو پچھلی کوتاہی پر شرمندگی ہے، جو اُس کو اِس طرف مائل کر رہی ہے۔

''رہنمائی'' کی آسان اور مضبوط شکل تو یہ ہے کہ اربابِ وفاق ہی ''تدریب المعلمین'' کا ایک سالہ کورس مرتب کریں اور اس کی باقاعدہ سند جاری کی جائے اور جب تک کسی وجہ سے اس کی عملی شکل نہ بنے، کم از کم بڑے مدارس پانچوں صوبوں میں اکابر اہل علم کی مشاورت سے نئے فضلاء کے لیے منہج ونظم مرتب فرمائیں اور اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے فضلاء کے لیے ''تدریب المعلمین'' کے مرحلے سے گزرنا، تقرری کے لیے شرط ورنہ کم از کم وجہِ ترجیح ضرور قرار دیا جائے، کیوں کہ یہ بات تو بہت زیادہ قابل غور ہے کہ جو طالب علم شعبان میں عالمیہ کا امتحان دے رہا ہے، وہ ۲ ماہ بعد مسند تدریس پر براجمان ہو جائے۔ آٹھ سالہ نصاب بہت جاندار

ہے، مگر پڑھانا ایک مستقل فن ہے، جو سیکھنے اور صحبت میں بیٹھنے سے آتا ہے۔

اس لیے پہلا مرحلہ تو یہ ہوگا کہ ہر عالم یہ سمجھ لے کہ میں نے ''پڑھانے'' کو سیکھنا ہے، جیسے ہم عصری شعبوں میں دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اور انجینئر کے لیے بغیر ہاؤس جاب یا ماہر کی زیرنگرانی کام کیے آگے بڑھنے کی صورت نہیں ہوتی، نہ ہی ہم اس سے استفادے کے روادار ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے بی ایڈ کی ڈگری ضروری ہے تو قرآن وحدیث کی امانت میں تساہل کیسے برداشت کرلیا جائے؟!

تدریب المعلمین کی عملی صورت

میری ان نگارشات کی حیثیت ''جھد المقل دموعه'' اور ''رانڈ کے رونے'' سے زیادہ شاید نہ ہو، مگر امید ہے کہ اربابِ علم ان باتوں سے نہ صرف متفق ہوں گے، بلکہ شاید یہ ان کے دل کی آواز بھی ہو۔ مقصد بھی یہی ہے کہ اس پر غور وفکر کا باب کھلے اور اللہ کرے کہ اس کی بہتر عملی شکل وجود میں آجائے۔ یہ بھی طے ہے کہ اس منہج کی تنقیح وتہذیب میں وقت لگے گا، مگر اس وقت تک اس کام کو چھوڑے رکھنا بھی معقول معلوم نہیں ہوتا۔ تجرباتی طور پر تو کچھ کام کرنے ہوں گے۔ یہ تجربہ خود بہت کچھ سکھادے گا۔ چناں چہ اس غور وفکر کے دروازے کو کھولنے کے لیے کچھ منتشر وبے ربط باتیں (جن کو تجویز کا نام بھی نہیں دے رہا) پیش خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ اربابِ علم وفضل جب اس رخ پر غور کرنا شروع کریں تو اس سے بہتر تجاویز سامنے آئیں گی۔

۱:.....فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے ایک کمیٹی اساتذہ کی تشکیل دی جائے جو ہر فاضل سے انفرادی طور علمی استعداد، گھریلو حالات اور ذاتی دلچسپی کا تفقد کرے، جس سے یہ اندازہ ہو کہ کس فاضل کا کس شعبہ میں لگنا موزوں ہے۔ واضح بات ہے نہ ہر عالم ہر شعبہ کے لیے موزوں ہوگا، نہ ایک ہی شعبہ سب کو لینے کا متحمل ہوگا۔ نیز یہ بھی دیکھنے کی بات ہوگی کس شعبہ میں کتنے افراد کی ضرورت ہے۔

۲:..... جب مختلف فضلاء کے لیے ان کے اساتذہ کی رہنمائی میں الگ الگ شعبے تجویز ہوگئے تو پھر اس شعبہ میں بھیجنے سے پہلے اس لحاظ سے اس کی ازسرنو تربیت کا کوئی نظام بنایا جائے، مثلاً: اگر کسی کے لیے شعبہ حفظ میں لگنا تجویز ہو یا کوئی خود اس طرف راغب ہو (جو کہ یقیناً ہونا چاہیے، کیوں کہ ہمارے علماء نے اس شعبہ کو یکسر نظرانداز کردیا ہے، جس کی تفصیل کی یہ جگہ نہیں) تو بجائے اس کے پہلے دن سے کلاس میں بٹھا کر معصوم بچے ایک ناتجربہ کار ساتھی کے حوالے کردیئے جائیں، ایک مخصوص وقت کے لیے اس کو حفظ کی کلاس سنبھالنے کی مشق کرائی جائے۔ اس حفظ کرانے کی مشق اور عملی تربیت کے لیے بھی ایک مقالہ درکار ہے، مگر سردست تو ایک خُطہ

پیش کرنا مقصد ہے۔

۳:......جن فضلاء کے لیے شعبہ کتب سے منسلک ہونا تجویز ہو، ان کے لیے ایک سالہ نصاب بطور تکمیل/تکملہ کے مرتب کیا جائے اور ان کو اس سے گزرے بغیر اور کامیاب ہوئے بغیر سبق حوالے نہ کیا جائے۔ تکمیل میں بنیادی طور پر فنون کی ایک ایک اہم کتاب کو بالاستیعاب اور تحقیق کے ساتھ پڑھایا جائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ کچھ عرصے پہلے تک ملک کے مختلف علاقوں میں بعض علماء، تکمیل کرانے کا شہرہ رکھتے تھے اور بلاشبہ ان کے پاس سے نکلے ہوئے علماء کی بصیرت مختلف ہوتی تھی۔

۴:......پھر اگلے مرحلہ میں بھی اس کو مستقل سبق حوالہ نہ کیا جائے، بلکہ کچھ عرصے کے لیے معاون مدرس کے طور پر کسی فن کے کہنہ مشق استاذ کے ساتھ جوڑا جائے، تاکہ عملاً تدریس کا طریقہ سامنے آئے۔ اس کی اس سے بہتر کیا مثال ہوگی کہ جامعہ علوم اسلامیہ کے بانی ومحدث العصر علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے سنن ترمذی کا درس جب حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ جیسے فقیہ النفس کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو ایک سال ان کو ہم اپنے درس میں شریک رکھا۔

۵:......اخلاقی ونفسیاتی تربیت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ تعلیم وتربیت میں ایک خاص وصف آپ کی شفقت، دل سوزی اور خیر خواہی کا تھا۔ ذخیرۂ حدیث ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے جن کو ہم پڑھاتے ہیں، مگر عملی تطبیق کی طرف توجہ نہیں۔ صحابی کا زنا کی اجازت مانگنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ جواب اور اعرابی کا مسجد میں پیشاب کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے سمجھانا، جس کو بعد میں وہ یاد کیا کرتے تھے۔ یہ دو واقعات بطور مثال اور اشارے کے لکھے کہ بیان کی حد تک تو ہمیں یہ قصے متحضر ہیں، مگر عمل کے لیے......۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی کتاب ''الرسول المعلمؐ وأسالیبہ فی التعلیم'' اس موضوع پر لائق مطالعہ ہے۔

مزید براں! استاذ کا طالب علم کی نفسیات سے واقف ہونا بھی از حد ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ نفسیات ایسی چیز ہے کہ درسگاہ کے پچاس طلبہ میں سے ہر ایک کی دوسرے سے الگ ہوسکتی ہے۔ یہ تو نبوی طریقۂ تعلیم کا ایسا اہم باب ہے، جس پر مستقل مذاکرے اور تمارین کی ضرورت ہے۔

۶:......نمبر وار سلسلے میں تو یہ ۶ نمبر پر ہے، مگر اہمیت کے لحاظ سے سب سے مقدم ہے اور وہ ہے ہر عالم کی اصلاحی تربیت، جو دارالعلوم دیوبند (جس کے ہم خوشہ چین کہلاتے ہیں) کا خاصہ وامتیاز تھا۔ خود تو اس بارے

میں کیا عرض کروں، شوال ۱۴۰۳ھ کے ماہنامہ البلاغ کے ایک مضمون میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''دار العلوم دیوبند اور اس کے فیض یافتہ دوسرے دینی مدارس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے علم برائے علم کو کبھی مقصد نہیں بنایا، چناں چہ وہاں کے تمام طلبہ درسیات سے فراغت کے فوراً بعد کسی شیخ کامل سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کر لیتے تھے۔''

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''افسوس کہ اب دینی مدارس اور ان کے فارغ التحصیل حضرات میں اپنی اصلاح وتربیت کا ذوق ختم ہوتا جارہا ہے، بلکہ بہت سی جگہوں پر سلوک وتصوف اور تربیت وارشاد کو مدفضول سمجھ لیا گیا۔''

البلاغ ہی کے جمادی الثانیہ ۱۴۰۴ھ کے شمارے میں ''دینی مدارس- نصاب ونظام'' کے عنوان کے تحت حضرت لکھتے ہیں:

''کوئی مادہ پرست کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کا مدرسے کے مقاصد پورے ہونے اور اچھے طلبہ کی پیداوار سے کیا تعلق ہے؟ مگر ہم اکابر علماء دیوبند کے نام لیوا ہیں، ان باتوں کو مدرسے کی کامیابی اور ناکامی سے بے تعلق نہیں قرار دے سکتے۔ ان مدارس کی بنیاد اخلاص، للّٰہیت اور تقوی پر ہے الخ۔''

اس لیے استاذ کا دین وعمل کے میدان میں نمونے بننا از حد ضروری ہے، مگر یہ بات صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے طلبہ کے لیے نہ سہی، ہر فاضل کو تو اس کی ضرورت محسوس ہونی چاہیے اور نہ ہو تو کرانی چاہیے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کر کے تعلق مع اللہ کے مدارج طے کرنے ہیں۔

ان بے ربط باتوں پر مضمون کو سمیٹتے ہوئے وہی بات دہراؤں گا کہ یہ خاکہ حتمی نہیں، بلکہ ایک سوچ کی طرف افاضل کو توجہ دلانا ہے، جو بلاشبہ اس کی بہتر صورت مرتب کریں گے۔

مختصر ورکشاپ کا انعقاد

پھر یہ باتیں نئے فضلاء ہی کے لیے صرف نہیں، بلکہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال، ہر مدرسے میں اس عنوان پر یاددہانی کے لیے ورکشاپ کے انداز میں ایک روزہ یا دو روزہ نشست کا اہتمام کیا جانا بھی ضروری ہے، جس میں مختلف عنوانات پر ماہرین ومتقنین سے فائدہ اُٹھایا جائے اور تذکیر کی ضرورت تو ہر انسان کو ہر وقت ہوتی ہی ہے۔ ہمارے جامعہ بنوری ٹاؤن میں ۲۰۰۷ء میں اس طرح کا مذاکرہ ہو چکا، جس کا فائدہ ایک معتد بہ

عرصے تک بہت سے اساتذہ نے محسوس بھی کیا اور اب بھی شوال ۱۴۳۹ھ میں نئے تعلیمی سال میں اسباق سے پہلے اس نظم کو سوچا گیا ہے۔

اضافی گزارش

ایک مؤدبانہ درخواست یہ بھی ہے کہ تقسیم اسباق کے طریقہ کار پر بھی اہل مدارس کو نظر ثانی کرنی ہوگی۔ واضح بات ہے کہ نئے مدرس کو اگر فوقانی درجے کا سبق نہیں دیا جا سکتا تو ابتدائی سال میں جن میں استعداد بنا کرتی ہے، وہاں مبتدی طلبہ کو نئے استاذ کے آگے تختۂ مشق بنانا بھی محل نظر ہے۔ پھر یہ بھی عجیب طرزِ عمل ہے کہ ایک مدرس کے پاس اگر تین سبق ہیں تو وہ تین الگ الگ فنون کے ہیں، (وہ بھی اس کے ذوق کی رعایت کے بغیر) نیز وہ اسباق بھی بعض مرتبہ ہر سال بدل رہے ہوتے ہیں یا بدلوائے جاتے ہیں، حالاں کہ مجھ ناقص کی رائے میں ایک کتاب کو تین سے چار مرتبہ جب پڑھایا جائے تو اُس وقت گویا خود مدرس کو صحیح معنوں میں وہ کتاب سمجھ میں آنا شروع ہوتی ہے۔ پھر ہی تفہیم اور اس کے بعد تسہیل و تفہیم کا ملکہ پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تو صورت حال یہ بنی ہوئی ہے کہ دو ایک سال ایک کتاب پڑھا کر ابھی مناسبت قائم ہونا شروع ہوئی ہوتی ہے کہ اس کو کسی نئے فن کی کتاب سے دوستی کرنی پڑ جاتی ہے، اس لیے بجائے اس کے کہ ہر استاذ متنوع فنون سے نبرآزما ہو، ذوق و استعداد کے لحاظ سے مختلف مدرسین کو الگ الگ فنون میں سے گزار کر رسوخ / نبوغ پیدا کرا کر تیار کیا جائے۔ چند سال بھی نہیں گزریں گے کہ انہی نوعمر اساتذہ میں سے، ہر فن کے لیے کہنہ مشق استاذ مہیا ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان نگارشات کو قبول کرے، مدارس کو ترقی دے اور اہل مدارس کو اپنی رضا کے موافق اپنے کام میں لگائے، آمین۔

و صلی اللّٰہ و سلم علی سیدنا محمد و آلہٖ و صحبہٖ أجمعین